امت مسلمہ کی تشکیل نو

تحریر: راشد شاز

اسلام پوری انسانیت کے لیے خدا کا پسندیدہ دین ہے اور محمد رسول اللہ کافۃ للناس بشیرا و نذیرا اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ اسلام کی یہ دعوت جسے آخری نبی اور ان کے سچے متبعین کے ہاتھوں تاریخ کے آخری لمحے تک انسانیت کی رہنمائی کرنی ہے کسی قومی یا ملی شناخت کا نام نہیں بلکہ غیر مشروط سپردگی کے اس والہانہ رویے کا نام ہے جس کا اظہار انسانی تاریخ میں تسلسل اور ترتیب کے ساتھ انبیائے کرام کے ذریعے ہوتا رہا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں تاریخ کے مختلف ادوار میں، تمام ہی انبیاء انسانوں کو غیر مشروط عبودیت کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ اب جب سلسلۂ رسالت اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے، سپردگی کی اس تحریک کو اپنے انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری محمد رسول اللہ کے متبعین پر عائد کی گئی ہے۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ انبیائے سابقین کی دوسری امتیں یا متقین کے دوسرے گروہ ہمیشہ ہمیشہ اس عظیم نبوی تحریک سے باہر کر دیئے گئے ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے جہاں متبعین محمد کو کلیدی اور مرکزی کردار ادا کرنا ہے وہیں دوسری اقوام کے متبعین کو بھی اس انبیائی تحریک میں اپنی بساط بھر شریک ہونا ہے کہ انسانیت کی فلاح کا کوئی وسیع پروجیکٹ وسعتِ نظری اور وسعت قلبی کے بغیر انجام نہیں پاسکتا۔ اگر اسلام کی دعوت سے مراد کسی خاص لسانی، قومی، جغرافیائی یا ملی گروہ کا غلبہ نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت کی سعید روحیں خواہ وہ دنیا کی کسی قوم یا ملت میں پائی جاتی ہوں اس تحریک میں اپنے اندر والہانہ شرکت کا داعیہ محسوس نہ کریں۔

قرآن کا معمولی طالب علم بھی اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ ابراہیمؑ سے لے کر محمدؐ تک اس دنیا میں انبیاء کے ذریعے انسانوں کو جس بات کی طرف بلایا جاتا رہا ہے وہ خدا کے آگے غیر مشروط سپردگی کی یہ دعوت ہے جسے ہم اسلام سے موسوم کرتے ہیں۔ ابراہیم، اسحٰق و اسمٰعیل بنی اسرائیل کے تمام انبیاء اور دیگر اقوام کی طرف بھیجے جانے والے نبی حتیٰ کہ وہ بھی جن کا تذکرہ قرآن میں موجود نہیں ہے، ایک ہی دین کے امین اور مبلغ رہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کے حوالے سے مسلم ذہنوں میں کسی قسم کے گروہی تعصب کا داعیہ پیدا ہو۔ قرآن مجید کی یہ تنبیہ کہ اہل ایمان انبیاء کے سلسلے میں (لانفرق بین احد من رسلہ) (البقرۃ:285) کے رویے پر عامل ہوتے ہیں، دراصل اسی بات کو ذہن نشین کرانا ہے کہ خانوادۂ نبوت کے تمام ہی عالی مقام حاملین ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک کی شخصیت یا دعوت دوسرے سے متصادم یا متعارض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ کے متبعین کے لیے اس بات کو لازم کیا گیا کہ وہ نہ صرف اس کتاب پر ایمان لائیں جو محمدؐ کی طرف بھیجی گئی ہے بلکہ ان تمام سابقہ کتب اور انبیاء کو بھی اسی نبوی تحریک کا حصہ سمجھیں جن کے باقیات دنیا کے مختلف خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ گویا آخری رسولؐ کی بعثت سے کسی نئے دین کی داغ بیل نہیں ڈالی جارہی ہے اور نہ ہی قرآنی وحی کسی نئی ابتداء کا سامان ہے بلکہ یہ پچھلوں کی تصدیق کرنے اور باقیات امم سابقہ کے ورثے کو سمیٹتے ہوئے، بنیادی باتوں پر ان کو اشتراک عمل کے ذریعے ایک ایسے عالمی انقلاب کی بنیاد رکھنے جارہی ہے، جس میں تمام ہی انبیائے سابقین کی دعوتوں کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔

محمد رسول اللہ نے کسی نئی امت کی بنیاد نہیں رکھی اور نہ ہی اپنے متبعین کو کسی نئے گروہ سے موسوم کیا۔ قرآن کا انداز دعوت اس نکتہ کی مسلسل وضاحت سے عبارت ہے کہ محمد رسول اللہ کسی نئی امت کے قیام کے بجائے اطاعت گزاروں کے اسی خانوادے کے احیاء کے لیے تشریف لائے ہیں جن کی باقیات مختلف شکلوں میں اس سرزمین پر موجود ہے اور جن کا نظری و فکری ماحصل اب صرف یہی رہ گیا ہے کہ وہ انبیائے سابقین سے اپنا نسلی یا مذہبی رشتہ بتاتے رہیں اور اسے اپنی نجات کے لیے کافی سمجھیں۔

(وقالوا كونوا هودا أو نصارىٰ) کے جواب میں یہ کہا جانا کہ (قل بل ملة إبراهيم حنيفا)(البقرة:135) دراصل اسی وسعت فکری کا اظہار تھا کہ آخری نبی کسی نئی امت کے قیام کا داعی نہیں بلکہ امت ابراہیمی کا احیاء کرنے والا ہے اور اسکی دعوت تمام انبیائے سابقہ کی دعوتوں کا ارتکاز ہے:(قل إنني هداني ربي إلى صراط مستقيم دينا قيما ملة إبراهيم حنيفا)(الانعام:161)۔ قرآن مختلف اسالیب میں بار بار اس حقیقت کو ذہن کراتا ہے کہ متبعین محمد کو جو کچھ عطا ہوا ہے یہ وہی دین ہے جو اس سے قبل انبیائے سابقین لاتے رہے ہیں: (شرع لكم من الدين ما وصى به نوحا والذي أوحينا إليك)(الشوریٰ:13)۔ دین ابراہیمی کے سابق دعویداران انبیائے سابقین کے متبعین سے باسالیب مختلف یہ بات کہی جاتی رہی کہ فی زمانہ دین ابراہیمی کا امین محمدؐ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے:(إن أولى الناس بإبراهيم للذين اتبعوه وهذا النبي والذين آمنوا)(آل عمران:68)۔ رہے وہ لوگ جو محمدؐ پر ایمان لے آئے ہیں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ نئے نبی کی قیادت میں اسی دین پر کاربند ہیں جس کے بابت انہیں اس سے پہلے توراۃ و انجیل میں انہیں بتایا جا چکا ہے۔(الذين يتبعون الرسول النبي الأمي الذي يجدونه مكتوبا عندهم في التوراة والإنجيل)(الاعراف:157) محمد رسول اللہ انبیائے سابقین کی جس وراثت کے امین ہیں اور جس مشن کو خوشگوار انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری آپ پر عائد کی گئی اس سے فطری طور پر یہ بات مترشح ہوتی تھی کہ آخری نبی کسی خاص نسل، گروہ یا جغرافیائی سرحدوں میں رہنے والے انسانوں کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے پیش نظر عام انسانیت کی فلاح ہے۔ کسی ایسے بین الاقوامی نبی سے، جس پر آنے والی پوری تاریخ کا انحصار ہو، یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی کوئی الگ امت بنائے گا اور صرف اس کی فلاح و نجات کو اپنا ہدف قرار دے لے گا۔ دین ابراہیمی کے سچے وارث کی حیثیت سے محمدؐ رسول اللہ بھلا ایسا کیسے کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم تاریخ کے ابتدائی ایام میں کسی گوشہ سے امت محمدیہ کی اصطلاح سننے میں نہیں ملتی۔ محمدؐ ہی پر کیا موقوف دنیا کے کسی نبی نے بھی اپنی ذات کی بنیاد پر کسی امت کی تشکیل کی کوشش نہیں کی۔ یہودی، نصرانی، بدھشٹ جیسی شناختیں بہت بعد کی پیداوار ہیں جو اپنے داعیوں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے متبعین نے ایجاد کر ڈالیں۔ نبی کا یہ مقام نہیں وہ وحدت آدمیت کو ٹکڑوں میں بانٹنے یا خدا کی طرف بلانے کے بجائے اپنی شخصیت پرستی کی دعوت دے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص کو خدا کتاب و حکمت اور نبوت سے سرفراز کرے وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ لوگو میری شخصیت پرستی میں مبتلا ہو جاؤ كونوا عبادي (3:79) تمام انبیاء کی طرح محمد رسول اللہ کی دعوت بھی (كونوا ربانيين) سے عبارت ہے۔ ایک ایسی دعوت جس پر ابراہیم و اسمٰعیل، اسحٰق و یعقوب، ان کی نسلیں، موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دیگر تمام انبیاء شہادت دیتے رہے ہیں۔ جو لوگ محمد پر ایمان لائے ان کے لیے تکمیل ایمان کی شرط کے طور پر یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ان انبیاء میں کوئی فرق نہیں کرتے (لا نفرق بين أحد منهم ونحن له مسلمون)(آل عمران:84)

(کونوا ربانیین) کی دعوت جب اپنے محور سے ہٹ جاتی ہے اور دین داری کے نام پر گروہی عصبیت یا انبیاء اور ان کے سرکردہ متبعین کی شخصیت پرستی جزو دین قرار پاتی ہے تو دراصل اس Process کا آغاز ہو جاتا ہے جسے ہم دین کے حوالے سے دین کی نفی کا نام دیتے ہیں۔ یا جسے عرف عام میں مذہب، مسلک یا رسوم عبودیت کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر دین رویۂ سپردگی کے بجائے شناخت قرار پاتا ہے۔ امتیں اپنے انبیاء کی شاندار تاریخ اور اس سے اپنے تعلق کو وجہ نجات قرار دے لیتی ہیں۔ اہل یہود و نصاریٰ کی ان خوش گمانیوں کا قرآن میں بکثرت بیان ملتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کا یہودی یا عیسائی ہونا ان کی نجات کے لیے کافی ہے۔ قرآن نے شناخت یا نسبت کی بنیاد پر نجات کے خیال کو مسترد کر دیا اور یہ بات واضح کر دی کہ (قل یا أهل الكتاب لستم علی شيء حتی تقيموا التوراة والإنجيل)(المائدہ:68)۔ رہی یہ بات کہ ربانیوں کا یہ گروہ جو نئے نبی کی قیادت میں نجات کا طالب ہے اپنے لئے جو بھی شناخت اختیار کرے تو جس طرح وقت کے مسلمانوں (اہل یہود و نصاریٰ) کی انبیائی نسبتیں ان کی نجات کے لیے کافی نہیں ہو سکتیں اور یہ دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا کہ ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحٰق و یعقوب یہودی یا نصاریٰ تھے۔ اسی طرح کوئی یہ نہ سمجھے کہ محمدؐ کوئی نئی شناخت یا نیا گروہ بنانے آئے ہیں یا ایسی کوئی شناخت ان کے متبعین کے لیے وجہ نجات ہو سکتی ہے۔ شناخت کی بنیاد پر نجات کے اس جھگڑے کا فیصلہ یوں کر دیا گیا کہ خدا کے نزدیک اہمیت عمل کی ہے (ولنا أعمالنا ولكم أعمالكم ونحن له مخلصون)(البقرۃ:139)۔ ان تمام غیر معتبر شناخت کے مقابلے میں نئے نبی کی قیادت میں ربانیوں کا جو گروہ تشکیل پایا ہے اس سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ گروہ بندی اور فرقہ پرستی سے اوپر اٹھ کر اپنے لئے ایک خدائی شناخت کو منتخب کرے (صبغة الله ومن أحسن من الله صبغة)(البقرۃ:138)۔ یہودی یا عیسائی شناختوں کے مقابلے میں اگر ایک نئی محمدی شناخت وجود میں آجاتی تو یہ سب کچھ ایک عالمی ربانی پیغمبر کے شایان شان نہ ہوتا جو بیک وقت تمام پچھلے انبیاء، ان کی کتابوں پر ایمان کو لازم قرار دیتا ہو اور جو سابقین اور ان کی باقیات کو اپنا فطری حلیف گردانتا ہو۔

ربانی بنام محمدی

متبعین محمد کی ابتدائی نسلیں جب تک ربانی شناخت سے متصف رہیں ان کے فکر و نظر پر یہ خیال غالب رہا کہ وہ دینِ ابراہیمی کی نقیب اور تمام انبیائے سابقہ کی وراثتوں کی امین ہیں۔ ان کی پیش قدمی مانند سیل رواں جاری رہی۔ گم گشتہ انسانیت کے قافلے، انبیائے سابقین کے باقیات جوق درجوق آخری نبی کی ربانی تحریک میں شامل ہوتے رہے۔ عام انسانوں کو ایسا لگتا تھا جیسے اس ربانی تحریک کے دروازے ان پر وا ہیں۔ یہ تحریک کسی مخصوص گروہ یا قوم کی سبقت یا بالادستی کی دعوت نہیں دیتی بلکہ اس کی وسعت میں پوری دنیائے انسانیت کی نجات کا سامان موجود ہے۔ خدائے واحد کی غیر مشروط بندگی کی یہ دعوت دنیائے انسانیت کو ایک دھاگے میں پروتی اور اسے ایک رشتۂ اخوت میں متحد کرتی۔ اطاعت گزاروں کا یہ قافلہ جس میں تمام ہی انبیاء اور ان کے سچے متبعین شامل بتائے جاتے تھے وحدت انسانیت کی ایک ایسی آفاقی دعوت تھی جس سے ہر ذی شعور شخص خود کو منسلک محسوس کرتا۔

تمام گروہی شناخت کی نفی اور ربانی شناخت پر اصرار کا ہی نتیجہ تھا کہ متبعین محمد کی پہلی نسل بادیہ نشین عربوں کے بے سروسامان قافلے جب مختلف سمتوں میں اس صدائے انقلاب کو لے کر نکلے تو عرب و عجم، شمال و جنوب ہر جگہ ان کا والہانہ استقبال ہوا۔ عام انسانوں نے ان بادیہ نشینوں کو اپنا نجات دہندہ تصور کیا۔ انہیں اس کا خیال بھی نہ آیا کہ ربانی دعوت کے ان علمبرداروں کا تعلق کسی اجنبی تہذیب سے ہے، ان کی زبان مختلف اور ان کا طرزِ زندگی عرب ثقافت کا امین ہے کہ داعی اور مدعو دونوں کے لئے زبان و ثقافت، رنگ و نسل کا امتیاز، جغرافیائی سرحدیں اپنی معنویت کھو چکی تھیں۔ تب ربانی تحریک میں ہر شخص خواہ وہ عرب ہو یا عجم اپنی شرکت کے یکساں مواقع دیکھتا تھا اور اپنی نجات کے لیے یکساں امکانات پاتا تھا۔ مشترکہ پیغمبرانہ وراثت کے یہ امین جو عالمی سطح پر ایک ربانی معاشرے کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے تھے، ابتدائی دنوں میں ربانی نظام زندگی کی ایسی نظیر قائم کی جس پر نہ تو کسی خاص ثقافت کے غلبہ کا گمان ہوتا تھا اور نہ ہی کسی امپائر سازی کا شبہ کہ متبعین محمد کی پہلی نسل اپنے طرز عمل سے ایمپائر بلڈنگ کی نفی کرتی رہی۔

البتہ رفتہ رفتہ جب قرآن کا آفاقی پیغام اور وحدتِ انسانیت کی دعوت نگاہوں سے اوجھل ہوتی گئی، ربانی پیغام عرب ثقافت کے قالب میں دیکھا جانے لگا اور ہمارے علماء و دانشور اس خیال کے قائل ہوتے گئے کہ مسلم ثقافت دراصل قرآنی دائرۂ فکر کا ہی فکری تسلسل ہے اور یہ کہ اسلام کے مفاد کو مروجہ مسلمانوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا، ہمارے یہاں ربانی طرزِ فکر کے زوال کا بگل بج گیا۔ عرب ثقافت فی نفسہٖ وجہ امتیاز قرار پائی اور غیر عربوں کو موالیوں کی شکل میں ربانی تحریک کی سرحد پر اکتفا کرنا پڑا۔ جب ایک بار ربانی دعوت کے بجائے خاندانی عزّو شرف، نسلی تفاخر اور عرب عصبیت جیسے عوامل کو اہمیت مل گئی تو پھر ربانیوں کے اس گروہ سے صبغۃ اللہ کا وہ مجموعی تاثر زائل ہوتا گیا۔ دیگر اقوام کے مقابلے میں مسلم قومی عصبیت ایک معتبر شناخت کی حیثیت سے سامنے آئی۔ خانوادۂ نبوت کے دوسرے گروہ اور سعید نفوس کے دیگر قافلے خود کو اس نئی مسلم تحریک سے الگ محسوس کرنے لگے۔ جن لوگوں نے محمد رسول اللہ کی بعثت کے بعد بھی اپنی یہودی، عیسائی جیسی شناختوں کو باقی رکھا تھا ان کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی تو عیاں تھی البتہ اب نئی مسلم قومی عصبیت کے سامنے آجانے سے خود ربانیوں کا یہ گروہ بھی فرقۂ محمدی کی نفسیات سے دوچار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بین الاقوامی رسول کو جو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے ایک مسلم قومی نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ پھر بہت جلد توحید کے ان علمبرداروں میں بھی اقوام سابقہ کی طرح، اپنے نبی کے حوالے سے گروہی شناخت کے داعیے نے سر اٹھایا۔ توحید کی علمبردار امت جو کبھی خدائے واحد کی بنیاد پر وحدت انسانیت کی علمبردار تھی اور جس کے دل و دماغ اس احساس سے معطر رہتے کہ وہ تمام انبیاء و رسل کی دعوتوں کا ارتکاز ہیں۔ بدقسمتی سے وہی لوگ خود کو امت محمدی کا علمبردار سمجھنے لگے۔ اس تنگ نظری نے انہیں صرف منصبِ نبوت سے ہی معزول نہیں کیا بلکہ آخرت کے سلسلے میں بھی بے شمار خوش گمانیوں اور امانیات نے ان کے عقیدے میں مستقل اپنی جگہ بنا لی۔

بھلا قرآن مجید سے بڑھ کر اور کون سا مستند وثیقہ ہو سکتا ہے جو محمد رسول کی غایتِ بعثت کی تشریح و تعبیر کر سکتا ہو۔ دفتین کی اس کتاب میں، جو آج تک پوری صحت کے ساتھ امت کو منتقل ہوتی رہی ہے، امت محمدیہ جیسی کوئی اصطلاح نہیں پائی جاتی۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں رسول اللہ کو ایک ایسے نبی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جو دینِ ابراہیمی کے احیاء کے لیے بھیجا گیا ہو اور جو اہلِ کتاب کے دیگر گروہوں کے مقابلے میں دینِ ابراہیمی کا سب سے مستند پیروکار ہے۔

امت محمدی کا نوتراشیدہ تصور اس بات سے عبارت تھا کہ اب تاریخ کے آخری لمحے تک صبغۃ اللہ کے حاملین کے بجائے ایک ایسی قوم اپنے غلبہ اور سیادت کی تیاری کر رہی ہے جو محمد رسول اللہ کی باقیات میں سے ہے۔ ظاہر ہے دوسری اقوام کے لئے امت محمدی کے سیاسی غلبہ یا اس کی عالمی قیادت میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر آنے والے دنوں میں اس قومی شناخت کی بنیاد پر اموی اور عباسی سلطنتوں کے جاہ و حشم، اسپین اور دہلی میں امت محمدیہ کے سیاسی عروج اور عثمانی ترکوں کی قیادت میں ملک گیری کی توسیع کا جو منظر سامنے آیا اس سے بھی یہی کچھ مترشح ہوتا تھا کہ امت محمدیہ دوسری اقوام پر اپنے سیاسی، عسکری اور تہذیبی تفوق کے لیے کوشاں ہیں۔ بظاہر مسلم ریاستوں کی سرحدیں وسیع ہوتی رہیں، عرب مسلم تہذیب و ثقافت کے مرکز میں علم و فن کے چراغ کی لو مسلسل تیز ہوتی رہی، مگر فی الواقع نظری اعتبار سے متبعینِ محمد کی یہ نسلیں مسلسل زوالِ فکر و نظر سے دوچار تھیں، جہاں منصبِ کار رسالت سے منہ موڑ کر اب ان کے ارباب حل و عقد اپنی کھال میں مست تھے۔ گروہی اندازِ فکر نے خود بین المسلمین خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جو لوگ کبھی وحدتِ انسانیت کے علمبردار تھے اب وہی لوگ آپس میں شیعہ سنی، حنفی شافعی شناختوں کے حوالے سے خونریز تصادم میں مبتلا ہو گئے۔ اس صورتِ حال نے اموی سلطنت کی بساط لپیٹ دی، عباسی سلطنت کا چراغ گل کر دیا۔ نظری اعتبار سے امت اتنے مختلف گروہوں میں بٹ گئی کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا کہ حق پر کون ہے اور کسے واقعی محمد رسول اللہ کا سچا امین کہا جا سکتا ہے۔ اہل فکر و نظر مسلسل اس خیال کا اظہار تو کرتے رہے کہ ہمارے تاریخی سفر میں کہیں کوئی بنیادی گڑبڑی ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے ہر اگلا قدم ہمیں اپنی منزل سے مزید دور کر دیتا ہے۔ مگر اصلاحِ احوال کے لئے جتنی بھی کوششیں ہوئیں ان کا لب لباب یہی تھا کہ امت محمدی کو کسی طرح غلبہ و تفوق عطا کر دیا جائے۔ اس خیال کی طرف توجہ کم ہی گئی کہ ربانی امت کا جو تصور ہمارے دل و دماغ سے محو ہو چکا ہے اور جس کی وجہ سے ہم گروہی انداز سے سوچنے اور محدود گروہی نتائج پیدا کرنے پر مجبور ہیں، اس آفاقی نقطۂ نظر کی از سرِ نو تشکیل کا کام کیسے انجام دیا جائے۔

امت مسلمہ کے وسیع آفاقی تصور سے دست کشی اور امتِ محمدی کے نئے نظری خول کی تعبیر نفسیاتی اور فکری ہر دو سطح پر پسپائی سے عبارت تھی، جس نے بہت جلد متبعینِ محمد کی اگلی نسلوں کو منصبِ سیادت سے معزول و معطل کر کے رکھ دیا۔ جب تک مسلمانوں کی موجودہ نسل کو کارِ نبوت کے اعلیٰ منصب کا پھر سے ادراک نہیں ہوتا اور ان کے دل و دماغ اس خیالِ تقلیب انگیز سے مامور نہیں ہوتے کہ وہ رحمۃ للعالمین کے امین، تمام انبیائی تحریکوں کے نکتہ ارتکاز اور تاریخ کے آخری لمحے تک انسانیت کی عمومی فلاح و نجات کی خاطر مبعوث کئے گئے ہیں تب تک وہ امت محمدی کے نفسیاتی گنبد میں خود کو مقید رکھنے پر مجبور پائیں گے۔

امت مسلمہ بنام امت محمدیہ

امت مسلمہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، جس کی تشریح و تعبیر اس دعائے براہیمی سے ہوتی ہے (**ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا أمة مسلمة لك وأرنا مناسكنا وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم**) (البقرۃ:128) اس دعا کی مزید تفسیر کرتے ہوئے اگلی آیتوں میں مزید ارشاد ہے کہ جو دین براہیمی سے بے رغبتی کرے گا وہ دراصل اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا ہے۔ وہی ابراہیم جس کی اطاعت پر خود قرآن نے گواہی دی کہ جب اس سے کہا گیا کہ اطاعت گزار بن تو بول اٹھا (**اسلمت لرب العالمين**)۔ بات یہیں ختم نہیں ہو گئی بلکہ

اطاعت گزاری کی یہ روایت انہوں نے آگے بڑھائی۔ ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی (یَا بَنِيَّ إِنَّ اللّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ)(البقرۃ:132) کہ تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم اطاعت گزاروں میں سے ہو۔ حضرت یعقوب جب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کے دل و دماغ پر بھی یہی فکر سوار تھی کہ میرے بعد ایسا نہ ہو کہ میرے بچوں کی اطاعت گزاری میں کوئی کمی واقع ہو جائے لہٰذا دنیا سے جاتے ہوئے انہوں نے اپنی اولاد سے اس بارے میں اطمینان حاصل کرنا مناسب سمجھا۔ بچوں کا یہ جواب (نعبد إلهك وإله آبائك إبراهيم وإسماعيل وإسحاق إلها واحدا ونحن له مسلمون)(البقرۃ:133) اس دعائے براہیمی کا تسلسل ہے جس میں ابراہیم نے اپنی ذرّیات میں سے امت مسلمہ اٹھانے کی التجا کی تھی۔

قرآنی بیان کے مطابق امت مسلمہ دراصل خانوادۂ نبوت اور ان کے سچے متبعین پر مشتمل ایک ایسا گروہ ہے جس نے تاریخ کے ہر لمحے میں اور دنیا کے ہر خطے میں غیر مشروط اطاعت گزاری کی ریت کو برقرار رکھا ہے۔ اطاعت گزاروں کا یہ گروہ زمان و مکان، نسلی، لسانی اور جغرافیائی سرحدوں سے بے نیاز ہے۔ جس نے سچی اطاعت اختیار کی اللہ نے اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ اطاعت گزاروں کے اس قافلے میں شامل ہونے اور قرب الٰہی کی بشارت کا مستحق قرار پانے کے لئے کسی کا عورت یا مرد ہونا بھی اس راہ کی رکاوٹ نہ بن سکا، (یا مريم إن الله اصطفاك وطهرك واصطفاك على نساء العالمين)(آل عمران:42) یا حضرت آسیہ کو آنے والی نسلوں کے لیے بطور نمونہ پیش کرنا اسی خیال کی تصدیق ہے کہ خدا کے نزدیک اطاعت گزاروں کے قافلے میں شمولیت کے لیے عمل کی ہی اہمیت ہے۔ دوسری تمام نسبتیں یا حوالے کچھ معنی نہیں رکھتے لہٰذا جو لوگ (کونوا هودا او نصاریٰ) پر اصرار کرتے ہیں یا جو امت محمدیہ سے نسبت کو نجات کے لیے کافی سمجھے بیٹھے ہیں ان کے لیے یہ تنبیہ و تحذیر ہے (قل بل ملة ابراهيم حنيفا) کہ وہ بلا پس و پیش ابراہیمی طریقے کو اختیار کر لیں۔ امت مسلمہ سے الگ کسی نبی کو فرقہ بندی کی عینک سے دیکھنا یا اس پر یہودی، نصرانی یا محمدی شناخت کے علمبردار ہونے کا الزام عائد کرنا، ایک ایسی بے اصل بات ہے جس کی تنبیہ کرتے ہوئے قرآن انبیائے سابقین کے متبعین سے کہتا ہے (ءانتم اعلم أم الله) تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ انبیاء پر اس طرح کی گروہ بندی کا الزام عائد کرنا دراصل بہت بڑا ظلم ہے حقیقت سے جان بوجھ کر چشم پوشی کرنا ہے۔ (ومن أظلم ممن كتم شهادة عنده من الله وما الله بغافل عما تعملون)(البقرۃ:140)۔

یہ ہے امت مسلمہ کا وہ تصور جو قرآن کے صفحات سے برآمد ہوتا ہے۔ ابراہیم و اسمٰعیل، اسحٰق و یعقوب اور تمام انبیائے سابقین اور ان کے سچے متبعین کی ایک جگمگاتی کہکشاں۔ جس طرح (محمد رسول الله والذين معه)(الفتح:29) آنے والی تاریخ میں سیادت پر فائز کئے گئے ہیں اسی طرح (ابراهيم و اسماعيل، اسحاق و يعقوب والاسباط)(النساء:163) پر مشتمل راہ یاب قدسی نفوس کے اس وسیع مجموعے کا نام امت مسلمہ ہے۔ جو لوگ پھر بھی اس بات پر اصرار کریں کہ امت مسلمہ سے مراد صرف امت محمدیہ یا اس سے نسلی تعلق رکھنے والے لوگ ہیں کیا وہ اس بات کی جسارت کر سکتے ہیں کہ براہیمی سلسلے کے دوسرے انبیاء کے متبعین یا آسیہ و مریم جیسی سپردہ نفوس کو امت مسلمہ کے اس وسیع دائرے سے باہر کر دیں۔

صرف اطاعت گزاروں کے لئے اہل ایمان یا اہل اسلام کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ اہل کفر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں سے توحید کا دامن جاتا رہا، گویا حبل اللہ سے ان کا تعلق ٹوٹ گیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی پراگندگئ فکر و نظر کی وجہ سے اب کسی عمل صالح کے لائق نہیں رہے۔ دائرہ توحید سے ایک بار باہر آجانا فسادِ فکر و نظر کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کر دیتا ہے۔ انبیاء کی وارث قومیں بھی اگر شرک کے راستے پر چل نکلیں تو ان کا شمار اطاعت گزاروں میں نہیں ہوسکتا۔(لقد كفر الذين قالوا إن الله هو المسيح ابن مريم)(المائدہ:17)یا(لقد كفر الذين قالوا إن الله ثالث ثلاثة)(المائدہ:73)جیسی آیتیں اس بات پر دال ہیں کہ خود کو اہل ایمان کہلانے والے لوگ بھی اگر توحید سے دست کش ہو جائیں تو ان کے اس صریح کفر کو خوشنما اصطلاحات یا فقہی معاریض میں نہیں چھپایا جاسکتا اور نہ ہی ان کا یہ کہنا ان کی نجات کی ضمانت بن سکتا ہے کہ(نحن ابنٰاء الله و احبآؤه)(المائدہ:18)۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے توحید کا دامن تھام لیا اور عمل صالح میں لگے رہے تو ان کے لیے کسی رنج و غم کی ضرورت نہیں۔

سورہ انبیاء میں انبیائے سابقین کے تذکرے اور ان کی اطاعت گزاری کے بیان کے بعد صریح الفاظ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ(ان هٰذه امتكم امة واحدة)(المؤمنون:52)اطاعے گزاروں کا یہ طویل سلسلہ جس میں ابراہیم سے لیکر لوط و سلیمان، ایوب و اسمٰعیل، ادریس و ذوالکفل، ذوالنون و زکریا، یحییٰ اور مریم جیسے پاکیزہ نفوس شامل ہیں، دراصل یہ ایک ہی امت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے آپس میں گروہ بندی کر لی (فتقطّعوا امرهم بينهم)(المومنون:53)البتہ ان سبھوں کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے سو ان میں سے جو کوئی نیک عمل کرے گا اور وہ اہل ایمان میں سے ہو گا، تو اس صریح وضاحت کے بعد اس بات کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ اہل توحید پر مشتمل اس ایک امت سے انبیائے سابقین کے سچے متبعین کو خارج کر دیا جائے(كان الناس امة واحدة)(البقرہ:213)،(ان هذه امتكم امة واحدة) کے تناظر میں (ان ابراهيم كان امة قانتا)(النحل:120) کے قرآنی بیان کو ملاحظہ کیجئے۔ وہی ابراہیم جو اہل توحید کے قافلے میں ایک خاص فضیلت کے حامل ہیں جن کی غیر مشروط اور بے مثال اطاعت گزاری پر خود قرآن گواہ ہے۔ اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنے اندر ابراہیم جیسے ایمان کی شان پیدا کریں۔ جو تمام جھوٹی شناختوں سے ماوراء رب کائنات کی عبودیت کا سچا رنگ لئے ہوئے ہے۔ دینِ ابراہیمی کے حاملین اور انبیاء سابقین کے تمام متبعین اسی راستے پر گامزن ہیں جس کی دعوت محمد رسول اللہ دے رہے ہیں۔ جن کے تذکرے سے توراۃ و انجیل کے صفحات پُر ہیں۔(الذين يتبعون الرسول النبي الأمي الذي يجدونه مكتوبا عندهم في التوراة والإنجيل)(الاعراف:157)۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اطاعت گزاروں کے اس قافلے میں مختلف چھوٹی چھوٹی امتیں پیدا ہو جائیں، خدا کے یہ برگزیدہ بندے جھوٹی گروہی شناخت میں مبتلا ہو جائیں کہ ایسا کرنا شرک کا دروازہ کو کھولنا ہے۔

امت مسلمہ کا یہی وہ ہمہ گیر تصور ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں انبیائے سابقین کی باقیات کے لیے ہمیشہ خیر سگالی کے جذبات کو برقرار رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ان ایام میں بھی جب اصحابِ رسول کو اہل کتاب کے بعض گروہوں کی سخت مخالفت کا سامنا تھا، ان جنگی حالات میں جب نزول قرآن کے وقت اہل یہود کے بعض گروہ مسلسل ریشہ دوانیوں میں مبتلا تھے، قرآن نے اہل کتاب کے ان سعید نفوس کی ستائش سے اجتناب نہیں کیا جو خود اپنے ہم قوموں کے برعکس خدا ترسی کی راہ پر گامزن رہے(ليسوا سواء من أهل الكتاب أمة قائمة يتلون آيات الله)(آل عمران:113)یا(ومن قوم موسى أمة يهدون بالحق)(المائدہ:159)جیسی آیات اسی بات کو ذہن نشین کراتی ہیں کہ انسانوں کو

محض کسی قومی شناخت کی بنیاد پر اہل کفر یا اہل ایمان کی گروہوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ جو خدا (ان اکرمکم عند الله اتقٰکم) کی بشارت دیتا ہو اور جس کا وعدہ ہو کہ (لاتزروازرۃ و زر اخریٰ) وہ بھلا یہ کیسے پسند کر سکتا ہے کہ کسی شخص کی نسلی یا گروہی شناخت اس کے عمل صالح کو ساقط الاعتبار قرار دینے کا سبب بن جائے۔ اہل ایمان خواہ وہ کسی بھی تہذیب میں پائے جاتے ہوں ان کے لئے تو قرآن میں واضح بشارت موجود ہے (إن الذين آمنوا والذين هادوا والنصارى والصابئين من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحا فلهم أجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون) (البقرۃ:62)۔

قرآن کی یہ آیت جس میں فلاح و کامرانی کی بشارت کا دائرہ امم سابقہ کے خدا ترسوں تک وسیع کر دیا گیا ہے، بعض اصحابِ علم و دانش کے لئے سخت ذہنی خلجان کا باعث بنتی رہی ہے۔ ہمارے خیال میں اس خلجان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان محمد رسول اللہ کی دعوت کو تمام انبیائے سابقین کے ارتکاز کے طور پر دیکھنے کا رواج کم ہی رہا ہے۔ حالانکہ قرآن باسالیب مختلف اس مجموعی تاثر کو بار بار ذہن نشین کراتا ہے کہ محمدؐ دینِ براہیمی کے داعی ہیں جنہیں امت مسلمہ کے احیاء اور تاریخ کے آخری لمحے تک اس کی قیادت پر مامور کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام جو تمام انبیاء کے ذریعے بلند کیا گیا کلمہ حق ہے، اس کا محور و مرکز خدائے واحد کی پرستش ہے یہ ایک God-centered دین ہے، جہاں انبیاء علیہ السلام کی جگمگاتی کہکشاں میں کسی نبی کو کسی نبی پر فوقیت نہیں دی جاتی۔ خدا کے سچے پرستار سبھوں پر بیک وقت ایمان لاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اسلام کو محمد الاصل Mohammad-centered دین کی حیثیت سے دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو دراصل ان کے ذہنوں پر St. Augustine جیسے عیسائی راہبوں کے عقائد کا سایہ ہے جنہوں نے اپنی تبلیغی اور فکری کاوشوں سے حضرت مسیح کو نجات کے لئے بنیادی پتھر باور کرا رکھا ہے اور اس طرح عیسائی تصور کائنات میں نجات صرف فرقہ عیسوی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید نجات جیسے مسئلہ کو سرے سے انسانی بحث و تمحیص کے دائرے سے باہر قرار دیتا ہے۔ روزِ آخر کون جنت میں جائے گا اور کسے واصل جہنم کیا جائیگا، یہ وہ حساس امور ہیں جن پر کوئی قولِ فیصل انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اہل کتاب کو تو چھوڑیے، انہیں تو قرآن دینِ محمدی کے فطری حلیف کے طور پر پیش کرتا ہے حتی کہ وہ لوگ بھی جن کے دامن شرک سے آلودہ ہو گئے ان کیلئے خدا کا ارشاد ہے کہ سزا و جزا کا یہ فیصلہ وہ بذاتِ خود روزِ حشر انجام دے گا۔ اس بارے میں کوئی گفتگو انسانوں کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے: (ان الله يفصل بينهم يوم القيامة) (الحج:17)۔

جس طرح مختلف شعوب و قبائل سے انسانوں کا تعلق محض تعارف کیلئے ہے (وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا) (الحجرات:13) اسی طرح یہ بھی خدائی اسکیم کا ایک حصہ ہے کہ اس کے سچے بندے مختلف دینی شناخت کے ساتھ جانے دیں (ولو شاء الله لجعلهم امة واحدة) (الشوریٰ:8) اگر خدا ترسوں کے مختلف گروہ انبیائے سابقین کی باقیات و ذرّیات، خود کو راہ یابی کے مختلف سلسلوں سے وابستہ پاتے ہوں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ توراۃ و انجیل بھی اسی خدا کی کتاب ہے اور وہاں ہدایت اور روشنی موجود ہے۔ انبیائی پیغام سے اپنا تعلق بتانے والوں کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی نجات کا فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھ جائیں یا اس خیال کی وکالت کرنے لگیں کہ لوگو! یہودی اور عیسائی ہو جاؤ نجات اسی میں ہے اور جو اس شناخت سے باہر رہ گیا اس کے لیے نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ اس کے برعکس قرآن کا مطالبہ ہے کہ انبیائی ہدایت کے امین، مختلف تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں، غیر ضروری مباحث میں اپنی قوتوں کو ضائع کرنے کے بجائے اس بات کی

کوشش کریں کہ وہ ایک دوسرے پر نیکی کے کاموں میں سبقت لے جائیں۔ خدا کے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ تمام انسانوں کو یا اہل حق کے تمام ہی گروہوں کو ایک امت بنا دیتا لیکن اس کی تو اسکیم یہ ہے کہ جس امت کو جو دیا گیا ہے اسی کی بنیاد پر اسے آزمائے:(**ولكن ليبلوكم في ما آتاكم فاستبقوا الخيرات**)(المائدہ:48)۔

مسلمانوں کی پہلی نسل جو انبیائی سلسلے میں محمد رسول اللہ کے مقام عظمت سے واقف تھی اس نے ان امور کو کبھی معرض بحث نہیں بنایا کہ روز محشر انبیائے سابقین کے متبعین کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہل کتاب کے حوالے سے وہ اس دعوت کے امین رہے کہ اے اہل کتاب آؤ ان بنیادی باتوں کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں:(**قل يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون**)(آل عمران:64)۔

جو لوگ انسانیت کی سیادت پر فائز کئے گئے ہوں ان کے مقام بلند کا یہ فطری تقاضہ تھا کہ وہ اہل حق کے تمام ہی گروہ کو وسعتِ قلبی کے ساتھ قبول کریں۔ تمام اہل حق پر نئی نبوی تحریک میں شرکت کا دروازہ کھلا رکھیں تبھی یہ ممکن ہے کہ انبیائے سابقین کے سچے اور جھوٹے دعویدار الگ ہو سکیں۔ جو لوگ واقعی خدا شناس ہوں گے وہ "**فاستبقوا الخيرات**" کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔ ربانی تحریک کی راہ میں ایسے خدا شناس لوگ مزاحم نہیں ہو سکتے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے یہودی یا نصرانی نسبتوں کو ہی وجہ نجات سمجھ رکھا ہے تو اس کے لیے صاف صاف بتا دیا گیا کہ (**قل يا أهل الكتاب لستم على شيء حتى تقيموا التوراة والإنجيل وما أنزل إليكم من ربكم**)(المائدہ:68) یہ نام نہاد اہل کتاب جو دین کے نام پر گروہی عصبیت جیسی لعنت میں مبتلا ہیں اور جن کا فرقہ ہی ان کے لیے الہٰ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تو شرک کے مارے ان نام ونہاد وارثینِ انبیاء سے تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گروہی عصبیت کا یہ زہر اور ان کی تنگ رجعت پسندانہ ذہنیت تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ سو اہل ایمان کو تلقین ہے کہ (**يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض**) (المائدہ:51)۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ اس قسم کے قرآنی بیانات اہل کتاب کی طرف کسی عمومی بیان کے مظہر ہیں کہ قرآن میں جابجا باقیات انبیائے سابقین کو نہ صرف یہ کہ شرکتِ عمل کی دعوت دی گئی ہے بلکہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے ممکنہ شبہات کا بھی ازالہ کر دیا گیا ہے (**ليسوا سواء من أهل الكتاب أمة قائمة يتلون آيات الله آناء الليل وهم يسجدون**)(آل عمران:113)۔

یہ بات کہ اہل کتاب مسلمانوں کے فطری حلیف ہیں ابتدائی عہد میں ایک امر مسلمہ کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی تھی۔ قرآن نے اہل کتاب سے موالات کی راہ کھلی رکھی تھی۔ ان کا کھانا پینا مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیا گیا تھا حتیٰ کہ معاشرتی تعلقات کے قیام کیلئے بھی صریح قرآنی ہدایات موجود تھیں۔ عفت مآبی کی شرط کے ساتھ اہل کتاب کی عورتیں بھی عفت مآب مسلمان عورتوں کی طرح حلال قرار دی گئی تھیں (**اليوم أحل لكم الطيبات وطعام الذين أوتوا الكتاب حل لكم وطعامكم حل لهم والمحصنات من المؤمنات والمحصنات من الذين أوتوا الكتاب من قبلكم**)(المائدہ:5)۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں تقویٰ اور پاکیزگی کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تنظیم نو کی جارہی ہو، جہاں گروہی نسبتیں، نسلی تفاخر اور جھوٹی دینی شناخت کالعدم قرار دی جارہی ہو، یہودی، عیسائی یا قومی مسلمان بنانے کے بجائے ربانی بنانے کا

غلغلہ بلند ہو، کسی کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ آنے والے دنوں میں متبعینِ محمد کا ذہنی افق اس قدر تنگ ہو جائے گا کہ ان کی نسلیں اپنے لیے ایک قومی شناخت کو گوارہ کرلیں گی اور مسلم ہونا ان کے درمیان رویے کے بجائے شناخت بن کر رہ جائے گا۔ بدقسمتی سے بعض سیاسی حوادث اور تاریخی عوامل نے آنے والے دنوں میں ایک ایسے ہی تنگ نظر متعصب قومی شناخت کی راہ ہموار کر دی جس کے لیے جلد ہی روایات و تاریخ کے ماخذ اور فضائل سے متعلق تراشیدہ قصوں نے ایک مستقل نظامِ فکر مرتب کرڈالا۔ امت مسلمہ جو خود کو تاریخ کے آخری لمحے تک قیادت کے منصب پر فائز سمجھتی تھی اور جو امم سابقہ کی باقیات کو اسی قائدانہ وسعتِ نظری سے دیکھتی تھی رفتہ رفتہ انہیں رقیب تصور کرنے لگی۔ امت محمدیہ کی نفسیات کے جنم لینے سے نہ صرف یہ کہ قائدانہ نفسیات اور وسعتِ نظری کا خاتمہ ہو گیا بلکہ مسلمانوں کے ذہنوں پر یہ بات نقش ہونے لگی کہ وہ بھی دوسری امتوں کی طرح ایک امت ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح قومی مسلمانوں نے بھی اپنی امت کو دوسری امت سے افضل باور کرانے کی خاطر خوش گمانیوں پر مشتمل روایات کی بھرمار کرڈالی۔ حتیٰ کہ ایسی روایتیں بھی وجود میں آگئیں جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ روزِ قیامت کس طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان بآسانی داخل جنت کئے جائیں گے۔ ایسا اس لیے کہ بعض روایتیں محمد رسول اللہ کو شفاعت کے اس منصب پر فائز کرتی تھیں جس کا یارا ابراہیم اور دوسرے انبیاء کو نہ تھا۔ بعض روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ اس دن لواء الحمد صرف محمدؐ کے ہاتھ میں ہو گا جو اپنی امت کی خاطر خصوصی شفاعت کے لیے سارا زور صرف کر دیں گے۔ جیسا کہ بعض روایتیں بتاتی ہیں ایسا محسوس ہو گا کہ گویا عام مسلمانوں کے ساتھ بھی انبیائے بنی اسرائیل جیسا معاملہ کیا جارہا ہے۔

امت مسلمہ کے منصبِ عظیم سے بہت نیچے لا کر امت محمدی کی قومی عصبیت کو فروغ دینے کے لیے جو روایتیں وضع کی گئیں اس میں اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا گیا کہ اس کی زد رسول اللہ کے منصبِ عظیم پر کس طرح پڑتی ہے۔ جو نبی تمام انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا اور جس کے رحمۃ للعالمین ہونے پر خود قرآن شاہد ہے اور جس کے بغیر آنے والی ساری انسانی تاریخ بے معنیٰ ہے، اس نبی کے بارے میں مسلمانوں میں یہ تصور عام ہوا کہ وہ دنیا سے بھی امتی امتی کرتا ہوا رخصت ہوا اور روزِ حشر بھی اپنی امت کو باریاب کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ جب رسول ﷺ کے بارے میں یہ خیال عام ہو کہ وہ عام انسانیت کے بجائے صرف اپنی امت کی فلاح و بہبودی کو مطلوب و مقصود جانتا ہو تو بھلا اس کے متبعین کے لئے یہ کیسے ممکن ہو تا کہ وہ اپنے تراشیدہ خولِ مسلمانی سے باہر آکر عام انسانیت کی نجات کی فکر اور اسے ہانکے پکارے فلاح و کامرانی کی طرف بلا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیادت پر فائز امت اپنی پیدا کردہ امانیات اور خوش گمانیوں کے زیر اثر خود ساختہ معزولی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔